قسط (۲)

مولانا سعید الرحمٰن ندوی
ناظم، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور، انڈیا

قرآن عظیم اور کائناتی زمینیں

زمینوں کی ایک خوفناک طبعی حقیقت

یہ مقالہ مضمون نگار کی غیر مطبوعہ تصنیف ''قرآن عظیم کی آفاقیت اور اس کا فلسفہ کائنات: خارج از زمین زندگی، انسان کی حقیقت اور خود اپنی اصلیت پر جدید اعجازی قرآنی بصائر'' کا تیسرا باب ہے۔ اس کے پہلے دو ابواب چار قسطوں میں ''الحق'' کے جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء اور فروری ۲۰۰۹ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

چنانچہ یہاں عذاب الٰہی کے نتیجے میں سطحی سیال پانی کے زیر زمین دھنس کر غیر سیال منجمد (solid) یا بخاراتی (vaporized) شکلوں میں تبدیلی کے لطیف قرآنی اشارے نے ہمارے موجودہ نظام شمسی کے ایک بڑے اور انتہائی گہرے سائنسی معمے کو نہایت اعجازی طور پر حل کر دیا ہے۔ لہٰذا جدید فلکیاتی سائنس کو یہاں مریخ اور زہرہ پر زمانہ قدیم میں ایسے سطحی سیال پانی کے ٹھوس اور ناقابل تردید علمی واستدلالی اور تجرباتی ومشاہداتی ثبوت فراہم ہوئے ہیں جو فی الحال اس شکل میں نہیں ہے، بلکہ مریخ کی حد تک اس کی زیر سطح منجمد برف (subsurface frozen ice) کی صورت میں کافی نیچے دھنسا ہوا ہے۔ جیسا کہ پہلے باب میں عرض کیا جا چکا ہے جدید سائنس کو مریخ پر اس کی قدیم تاریخ میں سیال پانی کے علاوہ کرۂ ہوا (atmosphere) بھی دریافت ہو چکا ہے، جو نہایت ہلکی مقدار میں آج بھی موجود ہے۔ لہٰذا سطحی پانی کی موجودگی میں جب کرۂ ہوا لازمی طور پر کثیف رہا تھا اس وقت وہاں کا سطحی درجہء حرارت (surface temperature) بھی زندگی کو سہارا دینے والا اور اس کا معاون ومددگار ہو سکتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر علمی وعقلی دلائل وبراہین کی بنیاد پر خود دنیائے فلکیات کا محتاط اندازہ ہے کہ ماضی بعید میں جب بھی حالات سازگار رہے ہوں وہاں زندگی کسی نہ کسی شکل میں قائم رہی ہوگی، جو بعد کے ناسازگار حالات کی وجہ سے ختم ہو گئی ہو۔ مگر زیر بحث قرآنی تصریحات کی روشنی میں اب ہمارے لئے یہ نتیجہ نکالنا نہایت آسان ہو گیا ہے کہ یہ سیارے حقیقتاً زمینیں ہی ہیں، جو ٹھیک ہماری موجودہ زمین ہی کے مانند سابق میں کبھی زندہ تھیں، اور وہاں انسانی وجناتی اور دیگر مخلوقات بھی آباد تھیں، جو مذکورہ بالا ڈھانکنے والے ﴿غَاشِيَةَ﴾ اور بنجر دن ﴿يَوْمٍ عَقِيمٍ﴾ کے عمومی عذابوں کے

ذریعے نیست و نابود کر دی گئیں، ان کا پانی زیر سطح خوب دھنسا دیا گیا، جس کی وجہ سے ان کا کرۂ ہوا بھی ختم ہوتا گیا، اور وہاں رفتہ رفتہ اسقدر ارضیاتی (geological) تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ وہ زمینیں آج تک بے آب و گیاہ صاف اور چٹیل میدانوں کے روپ میں اس طرح مردہ پڑی ہوئی ہیں گویا کہ وہ کل آباد ہی نہیں تھیں: ﴿حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ﴾ (ایسی صاف کہ گویا وہ کل آباد ہی نہیں تھیں)۔ یعنی آج ہماری موجودہ زمین والوں کو جس عذاب سے متنبہ کیا جا رہا ہے وہ سابق ہی میں مریخ وغیرہ زمینوں پر بعینہ نازل ہو بھی چکا ہے، اور مستقبل میں ہماری زمین کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے اس کا ایک ہو بہو اور حقیقی نمونہ ہماری عبرت و بصیرت کی خاطر خود ہماری ہی ''پچھاڑی'' میں مریخ وغیرہ کی شکل میں رکھ چھوڑ دیا گیا ہے! آج متعدد خلائی پروازوں کے ذریعے ان مردہ زمینوں کی لی گئی مختلف قریبی تصاویر کے ملاحظہ کے بعد ہی اس قرآنی تعبیر کی صحیح تصویر ذہنوں میں آسکے گی کہ تباہی و بربادی کا بھی کیا عالم کہ وہاں ماضی میں جاری و ساری تہذیب و تمدن کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہ سکا ہے، بلکہ اب وہاں جو کچھ بھی ہے وہ صرف بنجر و مسطح زمینیں اور چٹیل و بے آب و گیا میدان ہیں۔ لہذا حسب ذیل آیت میں ٹھیک اسی حقیقت کو مزید موکد کیا جا رہا ہے:

﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (احقاف:۲۷)

ترجمہ: یقیناً ہم نے تمہارے اطراف واکناف کی بستیوں کو ہلاک کر دیا ہے، پھر نشانیوں کو بکثرت تبدیل کر کے لایا بھی ہے، تاکہ وہ باز آجائیں۔

متقدمین نے یہاں ﴿مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى﴾ (تمہارے اطراف واکناف کی بستیاں) کا مخاطب اہل عرب کو مانا تھا۔ مگر چونکہ خطاب عام ہے اور اسے محدود کرنے کے لئے لغت اور شریعت دونوں ہی اعتبارات سے کوئی امر مانع بھی نہیں ہے اس لئے اسے عام برقرار رکھنا ہی اولیٰ و افضل ہے۔ لہذا اس صورت میں ہمارے یعنی ہماری زمین کے اطراف واکناف کی ہلاک شدہ بستیوں سے مراد ہمارے نظام شمسی کی دیگر زمینیں یعنی زہرہ، مریخ وغیرہ ہو سکتے ہیں، جو حقیقت واقعہ بھی ہیں۔ اور اگر اس دائرے میں مزید وسعت پیدا کی جائے تو اس سے ہمارے نظام شمسی کے گرد و پیش کے دیگر نظام ہائے شمسی میں پائی جانے والی زمینیں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مصنوعی ریڈیائی لہروں کی مدد سے ہمارا اپنے قرب و جوار کی دیگر زمینوں سے ربط و تعلق قائم ہونا اسقدر مشکل ہو گیا ہو۔

نیز یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ہم نے اپنے ''قرآن عظیم اور اس کا نظام کائنات'' والے مضمون میں دنیوی صرف ایک آسمان کے دریافت شدہ ایک کھرب کہکشاؤں میں سے ہر کہکشاں میں کم از کم ایک زمین کے وجود پر استدلال کرتے ہوئے اس آسمان میں کم از کم ایک کھرب زمینیں مراد لی تھیں، جب کہ یہاں صرف ہماری ایک کہکشاں کے تقریباً چار کھرب سورجوں میں سے صرف ہمارے ایک سورج کے سیاراتی نظام میں ایک سے زائد زمینیں -- زندہ یا مردہ -- ثابت ہو رہی ہیں۔ لہذا ان جدید قرآنی حقائق و بیانات کی روشنی میں بھی اور خود ہمارے ''قرآن عظیم اور

کائناتی مخلوق'' والے مضمون میں سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۵ کے تحت کی گئی ہماری بحث کو بھی مختصر رکھتے ہوئے زمینوں کی حقیقی تعداد پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

مریخ کی موجودہ مردہ صورت حال، جس میں اس کا کرۂ ہوا (atmosphere) تقریباً معدوم ہو چکا ہے، کائناتی تناظر میں ہمارے لئے ایک اور ہمہ گیر حقیقت اور گہری بصیرت کی بھی حامل ہے۔ چنانچہ وہ زمین جب زندہ تھی تو اس کا کرۂ ہوا کثیف رہا جانا ناگزیر ہے۔ اپنا استوائی قطر (equatorial diameter) پونے تیرہ ہزار کلومیٹر رکھنے والی خود ہماری موجودہ زمین کا کرۂ ہوا بھی اس وقت اس کے اطراف واکناف میں تقریباً ڈیڑھ ہزار کلو میٹر کی بلندی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح کرۂ ہوا کی موجودگی میں زمین کی موٹائی پونے تیرہ ہزار سے بڑھ کر پونے سولہ ہزار کلومیٹر ہو جاتی ہے۔ اور اس کی معدومی یعنی اس کی مردہ حالت میں یہ موٹائی سکڑ کر پھر سے اپنے اصلی پونے تیرہ ہزار کلومیٹر پر لوٹ آتی ہے۔ نیز یہ بھی ایک سائنسی حقیقت ہے کہ زمین اور مریخ وغیرہ زمینی سیارے اربوں سال سے سورج کے اردگرد اپنے اپنے مدار (orbit) میں نہایت تیز رفتاری سے گھوم رہے ہیں۔ لہٰذا اب جب کہ زمینوں کی متعدد زندگیاں اور متعدد اموات ثابت ہو چکی ہیں تو اس سے یہ حقیقت بھی مستنبط ہوتی ہے کہ وہ کبھی کرۂ ہوا کی موجودگی میں زندہ رہتی ہیں، جس سے ان کی جسامت بڑھ جاتی ہے، اور کبھی عذاب الٰہی کے ذریعے اس سے معدوم ہو کر مردہ ہو جاتی ہیں، جس کی وجہ سے سمٹ کر وہ اپنی اصلی جسامت کی طرف لوٹ جاتی ہیں۔ اس حقیقت کا تعلق نہ صرف ہمارے نظام شمسی کی زمینوں سے ہے بلکہ کائنات کی دیگر ساری زمینوں سے بھی ہے۔ چنانچہ اب ملاحظہ ہو کہ قرآن حکیم حسب ذیل آیات میں عین انہی حقائق کو کس قدر بلیغ ومعنی خیز تعبیر کے ذریعے بے نقاب کرنے والا ہے:

۱۴- ﴿أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا. أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا﴾ (مرسلات:۲۵-۲۶)

ترجمہ: کیا ہم نے زمینوں کو تیز رفتاری سے اڑتے ہوئے اپنا دامن سمیٹنے والی نہیں بنایا، اس حال میں کہ وہ بہت مرتبہ زندہ اور بہت مرتبہ مردہ ہوتی ہیں؟

سورۂ مرسلات کی ساتویں آیت میں ﴿إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ﴾ (تم سے جس کا وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی) کے ذریعے قیامت اور روز جزا کے یقینی وقوع کی خبر دیتے ہوئے آگے نوع انسانی سے بطور دلیل تین سوالات کئے جارہے ہیں۔ موجودہ آیات کا تعلق ان میں سے تیسرے سوال سے ہے۔ لہٰذا اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہاں انسان کو کسی بڑی حقیقت ہی کی جانب متوجہ کیا جارہا ہے۔ اور پہلے دو سوالات اس طرح ہیں:

﴿أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ. ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ﴾

ترجمہ: کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا ہے؟ پھر ہم دوسروں کو بھی ان کے تابع کر دیں گے۔

﴿أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ﴾

ترجمہ: کیا ہم نے تمہیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا ہے؟

آخر الذکر ان دونوں آیات پر تفصیلی کلام ہم آگے حسب موقع کریں گے۔ چنانچہ یہاں ﴿کِفَاتً﴾ "کَفَتَ، یَکْفِتُ" کا مصدر ہے، جس کے معنے تیزی سے اڑتے یا دوڑتے ہوئے اسی حالت میں اپنا دامن سمیٹنا ہوتے ہیں: "أسرع فی العدو والطیران وتقبض فیه" (لسان العرب)

"أسرع فی الطیران والعدو وتقبض فیه" (القاموس المحیط)

امام لغت وادب زمخشریؒ کی تحقیق کے مطابق، جس کی تائید امام رازیؒ، قاضی بیضاویؒ، علامہ آلوسیؒ جیسے کبار مفسرین نے بھی کی ہے، ﴿کِفَاتً﴾ جماع الابواب "فِعَال" سے ہونے کی وجہ سے اسم آلہ ٹھہر کر خود اس شے کا نام قرار پاتا ہے جس سے یہ فعل سرزد ہو رہا ہو: "هو اسم ما یکفت"

مثال کے طور پر "شَدَّ" کے معنے باندھنا ہوتے ہیں، چنانچہ باندھنے میں استعمال ہونے والے دھاگے ہی کو بطور اسم آلہ "شِدَادٌ" سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جو چیز تیز اڑتے ہوئے اپنا دامن سمیٹنے والی ہو خود وہی ﴿کِفَاتً﴾ قرار پاتی ہے۔ نیز ظاہر ہے کہ یہاں بھی ﴿الْأَرْضَ﴾ کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہو رہا ہے۔ لہذا جب زمینوں کو ﴿کِفَاتً﴾ سے تشبیہ دی جا رہی ہے تو اس سے جو عظیم الشان سائنسی حقائق منصوص طور پر منکشف ہو رہے ہیں ان میں سب سے پہلی حقیقت ہماری زمین سمیت دیگر ساری ہی زمینوں کی تیز رفتار گردش ہے! واضح رہے کہ ہماری زمین سورج کے اطراف اپنے مدار میں تقریباً ایک لاکھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گردش کر رہی ہے۔ نیز اس سلسلے کی دوسری طبیعی حقیقت یہاں زمینوں کو تیز رفتاری سے اڑتے ہوئے اپنا دامن سمیٹنے والی بتایا جا رہا ہے۔ اب یہ ایک نہایت منطقی و بدیہی بات ہوگی کہ اپنا دامن سمیٹنے سے قبل زمینیں اسے پھیلائے ہوئے ہی محو گردش ہوتی ہیں، کیوں کہ دامن اسی وقت سمیٹا جاتا ہے جب کہ وہ پھیلا ہوا بھی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زمینیں گردش کے دوران کبھی اپنا دامن پھیلائے ہوئے اور کبھی اسے سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔ پھر زمینوں کی ان دونوں کیفیتوں کے لئے بالترتیب ﴿أَحْيَآءً﴾ اور ﴿أَمْوَاتًا﴾ بطور حال لائے گئے ہیں۔ اول الذکر "حَیٌّ" بمعنی "زندہ" کی جمع ہے، جب کہ آخر الذکر "مَیِّتٌ" بمعنی "مردہ" کی۔ یعنی زمینیں جب اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہوتی ہیں تو زندہ ہوتی ہیں، اور جب اسے سمیٹ لیتی ہیں تو مردہ ہو جاتی ہیں۔ نیز ﴿أَحْيَآءً﴾ اور ﴿أَمْوَاتًا﴾ بطور صیغہء جمع لا کر یہ معنویت بھی پیدا کی جا رہی ہے کہ زمینیں صرف ایک ہی مرتبہ موت وحیات سے دوچار نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان میں یہ سلسلہ کثرت سے جاری و ساری ہے۔ چنانچہ اب غور کیا جا سکتا ہے کہ کیا ان کا یہ دامن ان کے کرۂ ہوا کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے! اس طرح ایک اور مرتبہ اور ایک بالکل ہی الگ پس منظر میں زمینوں کی متعدد زندگیاں اور متعدد اموات ثابت ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت ہماری زمین اپنا دامن ہوا پھیلائے ہوئے زندگی سے معمور ہے، جب کہ مریخ وغیرہ اسے سمیٹے ہوئے مخمور و مردہ پڑے ہوئے

ہیں۔ چنانچہ اس موقع سے ایک اور مرتبہ غور کیا جا سکتا ہے کہ ﴿السَّمٰوٰتُ﴾ کے بغیر مفرد طور پر صرف ﴿اَلْاَرْضُ﴾ ہی اپنی جنسیت پر کس معنی خیزی سے دلالت کرنے والی ہے، جس سے اس ضمن میں اخذ کردہ ہمارا سابقہ عمومی کلیہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتا ہے۔ اب موجودہ ارشاد باری کی مزید تاکید وتقویت کے لئے حسب ذیل آیات بھی ملاحظہ ہوں:

۱۵- ﴿ءَ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَآءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ. أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَآءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا، فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ. وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ. أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَٰٓفَّٰتٍ وَيَقْبِضْنَ، مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ، إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ. أَمَّنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ جُندٌ لَّكُمْ يَنصُرُكُم مِّن دُونِ الرَّحْمٰنِ، إِنِ الْكَٰفِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ﴾ (ملک:۱۶-۲۰)

ترجمہ: کیا تم اوپر والے سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے، پھر وہ اچانک تھرتھرانے لگے؟ کیا تم اوپر والے سے نڈر ہو گئے ہو کہ وہ تم پر پتھر برسا دے؟ پس عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسا تھا؟ ان سے قبل والے بھی جھٹلا چکے ہیں، سو میرا عذاب کیسا رہا؟ کیا انہوں نے اپنے اوپر اڑنے والوں کو اس حال میں نہیں دیکھا کہ ان میں بہت سے اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہیں اور بہت سے انہیں سمیٹ بھی رہے ہیں؟ رحمٰن ہی انہیں تھامے ہوئے ہے، یقیناً وہ ہر شے کی خوب نگرانی کر رہا ہے۔ بھلا تمہارا وہ کونسا لشکر ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں (جب وہ تم پر بھی عذاب بھیج دے) تمہاری مدد کر سکے گا؟ کافر تو بڑے دھوکے میں مبتلا ہیں۔

الفاظ قرآنی سے ظاہر ہے کہ ان آیات میں خطاب عمومی نوعیت ہی کا ہے۔ نیز ﴿طَيْرٌ﴾ "طَائِرٌ" کی جمع ہے، جس کا استعمال اڑنے والوں کے معنے میں غیر پرندوں کے لئے بھی ہوتا ہے، جیسے معروف عرب شاعر عنبری کا یہ قول:

"طاروا إليه زرافات ووحدانا" (سب لوگ اس کے پاس اجتماعی وانفرادی دونوں طریقوں سے بھی اڑ کر پہنچے)۔

اسی لئے ہوائی جہاز کے لئے بھی "طَائِرَةٌ" ہی کا استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ موجودہ آیات میں ﴿طَيْرٌ﴾ کا استعمال اسی دوسرے معنے میں ہوا ہے، کیوں کہ پرندے اڑنے کے دوران اپنے بازو جمع یا سمیٹ نہیں سکتے ہیں، جس کی تصویر کشی یہاں ﴿يَقْبِضْنَ﴾ کے ذریعے کی جا رہی ہے۔ اور نہ ہی یہ تعبیر ان کے پر مارنے یا پھڑ پھڑانے کے لئے درست ہو سکتی ہے، جس کے لئے موزوں الفاظ "رَفْرَفَةٌ" یا "صَفَقٌ" ہوتے ہیں۔ نیز اس آیت میں حقیقی طور پر پرندوں کا مراد نہ ہونا اس لحاظ سے بھی درست ہو سکتا ہے کہ متصل پچھلی آیت میں موجودہ انسان سے قبل بہت ساری نافرمان نسلوں کو عذاب الٰہی کے ذریعے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے بعد اس کی دلیل اور ثبوت کے طور پر ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا﴾ (کیا انہوں نے نہیں دیکھا) کے ذریعے اسے اوپر اڑنے والوں پر بصیرت آمیز نگاہ ڈالنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے پر آمادہ کیا جا رہا ہے تو اس سے کسی معنی خیز حقیقت ہی کی جانب اشارہ مقصود ہو سکتا ہے۔ اپنے بازو پھیلائے اور انہیں سمیٹتے ہوئے پرندوں کو دیکھنے سے کوئی بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم ان آیات کے باہمی ربط وتعلق کا بغور جائزہ لیں تو ظاہر ہوگا کہ یہ پانچوں آیات خدائی وعیدوں پر مشتمل ہیں، اور منطقی طور پر ایک دوسرے سے نہایت درجہ مربوط ومنضبط بھی۔ چنانچہ جس طرح پچھلے ارشاد باری میں زمینوں کو اجمالی طور پر ﴿كِفَاتًا﴾ (تیز رفتاری سے اڑتے ہوئے اپنا دامن سمیٹنے والی) سے تشبیہ دی گئی تھی یہاں اس کی تفصیل بطور کنایہ ﴿الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَٰٓفَّٰتٍ وَيَقْبِضْنَ﴾ (بہت ساری اپنے بازو پھیلائے ہوئے اور بہت ساری انہیں سمیٹتے ہوئے اڑنے والی) سے کی جارہی ہے، اور وہاں بیان کردہ زمینوں کی موت وحیات کو ان آیات کے ذریعے ایک ہمہ گیر فلسفہ تخلیق وتخریب اور تکلیف وتعذیب کا روپ دیا جارہا ہے۔ لہذا ان آیات کے ذریعے ہمیں یہ تلقین کی جارہی ہے کہ ہم اللہ کی گرفت اور اس کے عذاب سے بے خطر نہ ہوجائیں، کیوں کہ ہم سے قبل بھی اس کے بہت سارے نافرمان بندوں کو ہلاک کیا جاچکا ہے۔ پھر ان نافرمانوں کی ہلاکت کے فوری بعد ہم سے بطور دلیل اور بغرض عبرت سوال کیا جارہا ہے کہ کیا ہم نے اپنے اوپر تیز رفتاری سے محوگردش دیگر زمینوں کو اس حال میں نہیں دیکھا کہ ان میں بہت سی اپنے بازو پھیلائے ہوئے زندہ بھی ہیں، اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو عذابوں کے ذریعے انہیں سمیٹتے ہوئے مسلسل موت سے دوچار بھی ہورہی ہیں؟ یعنی ہم سے کہا جارہا ہے کہ ہم اپنے اوپر کائنات کی بہت سی نسلوں سے سبق حاصل کریں جنہیں ان کی زمینوں سمیت ہلاک کردیا گیا ہے، اور اس کے نتیجے میں وہ زمینیں آج تک مردہ اور بنجر ہی پڑی ہوئی ہیں۔

چنانچہ یہاں یہ قرآنی تعبیرات ﴿صَٰٓفَّٰتٍ﴾ اور ﴿يَقْبِضْنَ﴾ جنہیں ان زمینوں کی زندہ اور مردہ حالتوں کی تصویر کشی کے لئے بطور صفات لایا گیا ہے ایک اور بصیرت کی بھی حامل ہیں۔ لفظی ترکیب کے اعتبار سے ﴿صَٰٓفَّٰتٍ﴾ اسم فاعل ہے، جب کہ ﴿يَقْبِضْنَ﴾ فعل مضارع۔ عقل ومنطق کی رو سے یہ دوسری صفت بھی اسم فاعل یعنی "قَابِضَاتٌ" ہی ہوتی، کیوں کہ اول الذکر کا وصف نسبتاً زیادہ مستحکم اور پائیدار ہوتا ہے، جب کہ آخر الذکر کا وصف وقتی اور غیر پائیدار۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے اس مروجہ اسلوب بیان کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اس موقع سے دو مختلف النوع صفات کا قصداً استعمال ایک دہرے مقصد کے حصول ہی کی خاطر کیا ہے۔ ایک یہ کہ "قَابِضَاتٌ" کے استعمال سے سابقہ ادوار میں اسلام پر بے عقلی کا الزام عائد نہ ہوسکے، اور ذہنوں میں یہ سوال ابھرنے ہی سے رہ جائے کہ پرندے پوری طرح سے اپنے بازو سمیٹے ہوئے فضا میں کہاں اڑرہے ہیں؟ جب کہ ﴿يَقْبِضْنَ﴾ کی تعبیر نے وقتی طور پر اور ایک حد تک اس اعتراض کو ابھرنے پر روک لگانے کی خدمت انجام دی۔

اور اس سلسلے کا دوسرا اور نہایت بصیرت انگیز خدائی مقصد یہ ہے کہ جب ان الفاظ کے حقیقی معانی کا ظہور ہوجائے تو اسلوب بیان کی تبدیلی کے ذریعے اس مظہر الٰہی میں تاکید پیدا کرتے ہوئے نوع انسانی کو اعجازی طور پر اس حقیقت سے مطلع فرما کر اس کے اندر رجوع وانابت کا جذبہ بیدار کیا جاسکے کہ اس نے آسمانوں میں انسانی مخلوقات سے

لدی ایسی زمینوں کی تخلیق ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، جن میں سے کچھ اپنا دامن پھیلائے ہوئے زندہ ہیں تو کچھ اور ماضی ہی میں تباہ ومردہ ہوکر اسے سمیٹ بھی چکی ہیں، بلکہ کائناتی سطح پر مستقل ومسلسل تخریب وفنا کا یہ عبرتناک سلسلہ پوری قوت وطاقت اور شان وشوکت کے ساتھ ہنوز جاری وساری بھی ہے، اور آئے دن اس کا وقوع آسمانوں میں کہیں نہ کہیں ہو بھی رہا ہے!

پھر ﴿مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ﴾ کے ذریعے اس مفہوم کو اور زیادہ تقویت پہنچائی جارہی ہے کہ ان زمینوں کو تباہ وبرباد کردینے اور ان کی زندگی سلب کرلینے کے باوجود وہ باری تعالیٰ کی ذات رحمانی ہی ہے جو انہیں پوری مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے، تاکہ وہ اس کے نتیجے میں اپنا فطری توازن کھوتے ہوئے دیگر سیاروں سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہوجائیں۔ اور اس کے فوراً بعد ﴿أَمَّنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ﴾ کے ذریعے ہمیں متنبہ کیا جارہا ہے کہ اگر اس طرح کا عذاب ہم پر بھی لایا جائے تو ہمیں اس سے کون بچا سکتا ہے؟ پھر پچیسویں آیت میں ﴿وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ﴾ کے ذریعے کفار کی جانب سے اس وعدۂ عذاب کی تکمیل کے مطالبے کے جواب میں تیسویں آیت میں ﴿قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّأْتِيكُمْ بِمَآءٍ مَّعِينٍ﴾ کے ذریعے خود ہماری زمین کا پانی ختم کرکے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیے جانے اور اس کے بازوؤں کو بھی سمیٹ دیے جانے کی وعید پیش کی جارہی ہے۔ فی الواقع اگر دیکھا جائے تو سورۂ ملک اسم بامسمی اور اول تا آخر ایک ہی فلسفے کے تحت حد درجہ منظم ومنضبط ہے، جس میں تخلیق کائنات کی غرض وغایت اور خدائی ملکوتیت وبادشاہی کو ایمان افروز اور نہایت رقت انگیز اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ العزیز اس سورت کی بقیہ ابتدائی آیات پر مزید روشنی ہم اپنے اگلے مضمون میں کریں گے، جس سے ہماری مراد پوری طرح واضح ہوجائے گی۔

لہٰذا اسکا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے گرد ونواح میں اور بھی بہت ساری زمینیں ہیں، جن میں وقتاً فوقتاً مکلف مخلوقات کو خلعت وجود سے نوازا جاتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت سی زمینیں آج بھی آباد ہیں، اور بہت سی عذابوں کے ذریعے ختم ہوکر ویران پڑی بھی ہوئی ہیں، اور مسلسل ہوتی بھی جارہی ہیں۔ اور ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا﴾ (کیا انہوں نے نہیں دیکھا) سے مترشح ہورہا ہے کہ ان میں سے بہت سی زندہ یا مردہ زمینیں ہماری رؤیت بصری یا علمی میں آبھی سکتی ہیں۔ اس طرح یہ آخری دو بیانات اس باب کے سابقہ سارے ہی ارشادات کی تلخیص کرنے والے اور ان سب کو ایک ہی لڑی میں پرونے والے ہوجاتے ہیں۔ حسب ذیل آیت کریمہ بھی ہمارے اخذ کردہ اس مفہوم کو مزید موکد کرنے والی ہے:

۱۶- ﴿أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِي جَوِّ السَّمَآءِ، مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ، إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (نحل:۷۹)

ترجمہ: کیا انہوں نے خلائے آسمانی میں اڑنے والوں کو نہیں دیکھا کہ وہ بھی تابع کردیے گئے ہیں؟ اللہ ہی انہیں

تھامے ہوئے ہے۔ بیشک اس (مظہر ربوبیت) میں ایمان لے آنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں موجود ہیں۔

قدیم اہل لغت کے مطابق ﴿جَوٌّ﴾ سے مراد ''زمین اور آسمان کا درمیانی پورا حصہ'' ہے:

الجو: ما بين السماء والأرض (الصحاح، لسان العرب)

نیز انہی ماہرین زبان سے اس کا ایک اور معنیٰ ''ہوا'' کا ہونا بھی منقول ہوا ہے:

الجو: الهواء (المفردات، القاموس المحيط، لسان العرب، تاج العروس)

یہ دوسرے معنے اس لئے بھی مراد لئے گئے تھے کیوں کہ اس زمانے کی معلومات کے مطابق ہوا زمین اور آسمان کے درمیانی پورے حصے پر محیط تھی:

الهواء: الجو ما بين السماء والأرض (لسان العرب، تاج العروس)

لہذا جب ﴿جَوٌّ﴾ کا وجود زمین اور آسمان کے درمیانی پورے حصے میں تھا، اور موجودہ آیت میں خدائی مراد مفرد طور پر صرف اسی ایک لفظ کے ذریعے پوری ہو رہی تھی تو اِس وقت ذہنوں میں سوال ابھرتا ہے کہ یہاں اس کی اضافت آسمان کی جانب کرتے ہوئے ﴿جَوُّ السَّمَآءِ﴾ کیوں کہا گیا؟ کیوں کہ اس سے تاکید بھی مراد نہیں ہو سکتی ہے، اگر بات ایسی ہی ہوتی تو ''جَوُّ الْاَرْضِ'' کی اصطلاح زیادہ مناسب ہوتی۔ مگر عصر حاضر میں یہ ''خدائی معمہ'' نہایت صفائی کے ساتھ حل ہو گیا ہے۔ چنانچہ قدیم دور میں خلا کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جب کہ جدید تجرباتی و مشاہداتی سائنس کی رو سے ہمارا کرۂ ہوا سطح زمین سے تقریباً ڈیڑھ ہزار کلومیٹر ہی کی بلندی تک محدود ہے، جس کے بعد خلا کا بیکراں سمندر شروع ہو کر کھربوں نوری سال کی مسافت تک جاری رہتا ہے۔ اس طرح کرۂ ہوا کا تعلق زمین سے ہوتا ہے تو خلا کا آسمان سے، ایک فضائے ارضی (atmosphere) ہے تو دوسرا خلائے آسمانی (space)۔ اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ نے اسی خلائے آسمانی پر دلالت کرنے کیلئے ﴿جَوُّ السَّمَآءِ﴾ کی تعبیر قصداً لے آئی ہے۔ اس طرح یہ آیت کریمہ فضائے ارضی اور خلائے آسمانی دونوں کے بھی علاحدہ اور آزادانہ وجود کو منصوص طور پر اور نہایت بلیغ تعبیر کے ذریعے ثابت کرنے والی بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب غور کیا جا سکتا ہے کہ خلائے آسمانی میں اڑنے والے یہ ﴿طَيْرٌ﴾ سابقہ دونوں ارشادات ہی کی طرح زمینوں کے علاوہ اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اس طرح ایک اور مرتبہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں بھی ﴿طَيْرٌ﴾ کا استعمال زمینوں کے معنے میں بطور کنایہ ہی کیا گیا ہے۔

نیز بغیر کسی اضافت کے ﴿مُسَخَّرٰتٍ﴾ خبر دے رہا ہے کہ جس طرح ہماری زمین اس وقت خود ہمارے تابع کی گئی ہے ٹھیک اسی طرح وہ زمینیں بھی وہاں آباد دیگر مخلوقات کی خدمت گار بنائی گئی ہیں۔ اسی لئے اس کے بعد ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ﴾ کے ذریعے ہمیں یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ یقیناً اس امر میں ایمان لے آنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں موجود ہیں۔ نیز یہاں تعبیر کی یہ مماثلت بھی ملحوظ رہے کہ ﴿طَيْرٌ﴾ کے لئے جس طرح

پچھلے ارشاد میں ﴿مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ﴾ (رحمٰن ہی انہیں تھامے ہوئے ہے) کہا گیا تھا، ٹھیک اسی طرح یہاں انہیں ﴿مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ﴾ (اللہ ہی انہیں تھامے ہوئے ہے) کہا جارہا ہے، کیوں کہ لفظی مشابہت معنوی وحدت کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ چنانچہ دوبارہ غور کیا جاسکتا ہے کہ صرف ایک اضافت سے قرآن حکیم کس قدر عظیم علمی وتکوینی حقائق کی جانب نہایت بلیغ اشارات کر دیتا ہے، جو مناسب وقت ہی پر دو دو چار کی طرح واضح ہو جاتے ہوں۔ نیز ﴿طَيْرٍ﴾ کے اس مفہوم کی مزید تائید کے لئے حسب ذیل آیات بھی ملاحظہ ہوں:

۱۷-﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَٰفّٰتٍ، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ، وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ. وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ﴾ (نور:۴۱-۴۲)

ترجمہ: کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کوئی ہے وہ بھی اور خود اپنے بازو پھیلائے ہوئے اڑنے والے بھی اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں؟ چنانچہ ہر ایک اپنی نماز اور اپنی تسبیح جانتا ہے، اور وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اللہ اسے خوب اچھی طرح سے جانتا ہے۔ اور آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت اللہ ہی کے لئے ہے، اور اسی کے طرف لوٹ کر جانا بھی ہے۔

ان آیات میں ساتوں آسمانوں اور ان میں موجود ساری ہی زمینوں پر مشتمل کل کائنات پر باری تعالیٰ کی ملکوتیت اور اس کے جاہ وجلال کا رقت آمیز بیان ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس عمومی وآفاقی بیان کے بیچوں بیچ اپنے بازو پھیلا کر واقع ہونے والے ﴿الطَّيْرُ﴾ پرندوں جیسی حقیر اور موقع ومحل کے لحاظ سے نہایت غیر مناسب مخلوق نہیں بلکہ سابقہ ارشادات ہی کی طرح زندگی سے متصف اس کائنات کی عملی اکائیاں قرار پانے والی زمینیں ہی ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ یہاں ﴿يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ کے بعد ﴿وَالطَّيْرُ صَٰفّٰتٍ﴾ کا دوبارہ اعادہ فرما کر انسان کو یہ تلقین کی جارہی ہے کہ نہ صرف آسمانوں اور زمینوں کی کل مخلوقات اپنے خالق ومعبود کی تسبیح کر رہے ہیں بلکہ وہ ساری زمینیں جن میں یہ بود وباش اختیار کئے ہوئے ہیں خود وہ بھی اپنے بازو پھیلائے ہوئے تسبیح وتہلیل میں مصروف اور اپنی اپنی زندگی پر شکر بجالا رہی ہیں۔ چنانچہ ﴿وَالطَّيْرُ صَٰفّٰتٍ﴾ کے اسی مفہوم کو موکد کرنے ہی کے لئے ایک اور مرتبہ اگلی آیت میں ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ (آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت اللہ ہی کے لئے ہے) کے ذریعے یہ بتایا جارہا ہے کہ ان زمینوں کی یہ تسبیح وتہلیل اور شکر گزاری ان کی باری تعالیٰ کی بادشاہت وملکیت میں ہونے ہی کی وجہ سے ہے۔ نیز یہاں ایک اور مرتبہ تعبیر کا یہ حکیمانہ اختلاف بھی ملحوظ رہے کہ زمینوں پر دلالت کرنے کے لئے ایک ساتھ دو الفاظ ﴿الْأَرْضُ﴾ کو حقیقی طور پر اور ﴿الطَّيْرُ صَٰفّٰتٍ﴾ کو مجازاً اور بطور کنایہ لایا گیا ہے۔ چنانچہ اس سے اور اب تک کے سارے مجازی استعمالات کے ملاحظہ سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ یہ تدبیر الٰہی ایک جانب متقدمین کو خواہ مخواہ کے کسی اشکال واضطراب سے بچانے اور دوسری جانب متاخرین پر کلام اللہ کے عظیم علمی وعقلی اعجاز کو ظاہر کرنے کے دہرے

مقصد کے حصول ہی کی خاطر قصداً اپنائی گئی ہے۔

چنانچہ اس باب میں اب تک کے مباحث سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن حکیم قیامت کے مجموعی اور آفاقی ظہور سے قبل اللہ کے سرکش اور نافرمان بندوں پر دو الگ الگ اقسام کے عذابوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ عذاب کی ایک قسم وہ ہے جو جزوی اور علاقائی ہوتی ہے، جیسے وہ مختلف عذاب جو اس زمین کی موجودہ نسل انسانی کی بہت سی اقوام پر وقفے وقفے سے نازل ہوئے، مثلاً قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم لوطؑ وغیرہ اقوام کے عذابات۔ جب کہ دوسری قسم کا عذاب وہ ہے جو کسی بھی زمین کو عمومی طور پر اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور وہاں کی ساری ہی موجودات کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے، جسے وہ زمین کی موت سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ دوسری قسم کے عذابات ہیں جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہیں۔ قرآن حکیم کائناتی سطح پر اس عمومی عذاب کا فلسفہ اس طرح بیان کرتا ہے، جس سے ہماری موجودہ مراد مزید تقویت حاصل کر جاتی ہے:

۱۸- ﴿إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ، حَتّٰى إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ أَتٰهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ، كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (یونس:۲۴)

ترجمہ: دنیوی زندگی کی مثال ٹھیک اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمانوں سے برسایا، پھر اس کے ساتھ مل کر زمینوں کا سبزہ نکلا، جس سے انسان اور جانور کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمینیں اپنی رونق پر پہنچ چکیں اور آراستہ ہوگئیں اور ان کے باشندے سمجھ بیٹھے کہ وہ اس پر بالکل قابض ہو چکے ہیں تو (اچانک) ان پر ہمارا حکم رات کو یا دن کو آپہنچا، سو ہم نے انہیں ایسا صاف کر دیا گویا کہ وہ کل آباد ہی نہیں تھیں۔ اسی طرح ہم غور کرنے والوں کے لئے نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔

الفاظ قرآنی سے بالکل عیاں ہے کہ اس آیت میں کلام عمومی نوعیت ہی کا ہے، جس سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہاں بیان کردہ دنیوی زندگی سے مراد کسی بھی زمین کی زندگی ہو سکتی ہے۔ نیز یہاں چونکہ ﴿الْأَرْضُ﴾ کا استعمال ﴿السَّمَآءُ﴾ کے سیاق میں ہو رہا ہے اس لئے اس ترکیب سے ساری آسمانی زمینیں مراد ہیں۔ چنانچہ یہاں زمینوں کے ایک پورے حیاتیاتی دور کی تصویر کشی نہایت بلیغ اسلوب میں کی جا رہی ہے۔ ابتدا میں بقرہ والی آیت میں مردہ زمینوں کو بارش کے پانی سے زندہ کرنے کے بعد ان میں ہر طرح کے جاندار پھیلا دئے جانے کا بیان تھا۔ یہاں ٹھیک اسی حقیقت کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے کہ آسمانوں سے پانی برسانے کی وجہ سے زمینیں زندہ ہو کر ان سے سبزہ نکل آیا، جسے استعمال میں لے آنے کے لئے انسان اور جانور پیدا کئے گئے، پھر وقت کے ساتھ ساتھ زبردست مادی ترقی ہوئی۔ اس ترقی کے نشے میں انسان اتنا بدمست اور مادیت سے مخمور اور اپنی ہنرمندیوں پر اس قدر گھمنڈ میں

مبتلا ہوگیا کہ وہ روحانیت اور خداشناسی کو یکسر فراموش کر بیٹھا۔ اس کے نتیجے میں عذاب الٰہی اچانک آ پہنچا اور اس کا وجود صفحہ ہستی ہی سے مٹا دیا گیا۔ اور صرف اسی کا وجود نہیں بلکہ سارے ہی مظاہر حیات ولوازمات زندگی کو بھی نیست ونابود کر دیا گیا، جس سے زمینیں ایک اور مرتبہ اس طرح مردہ ہوگئیں کہ گویا وہ اس سے قبل کبھی آباد ہی نہیں تھیں۔ اور ان کی بربادی کا بھی یہ عالم کہ اس کے بعد اگر کوئی ان کا مشاہدہ کرے تو وہ انہیں زمینوں میں شمار کرنے ہی میں تردد میں پڑ جائے: ﴿فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ﴾ (سو ہم نے انہیں ایسا صاف کر دیا گویا کہ وہ کل آباد ہی نہیں تھیں)۔ لہذا یہاں بطور عبرت ایک اور مرتبہ غور کیا جاسکتا ہے کہ یہ مختصر ترین مگر نہایت بلیغ قرآنی تعبیر اب تک ہماری معلومات ومشاہدے میں قدرے تفصیل سے آئی مریخ وغیرہ زمینوں کی کس قدر حقیقت پر مبنی تصویر کشی کر رہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس قدر دلائل وشواہد کے باوجود اہل سائنس خود اس اچنبھے میں پڑے ہوئے ہیں کہ آیا انہیں زمینوں میں شمار کیا جائے یا نہیں۔ لہذا قرآن مجید ایک اور جگہ زمینوں کی موت وحیات کے پانی سے اس قدر گہرے تعلق کو اس طرح اجاگر کرتا ہے:

۱۹- ﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهُ، وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ. وَأَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَسْقَيْنٰكُمُوْهُ، وَمَآ أَنْتُمْ لَهُ بِخٰزِنِيْنَ. وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ. وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِيْنَ. وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ، إِنَّهُ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾

(حجر:۲۱-۲۵)

ترجمہ: ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں، مگر ہم اسے ایک معلوم مقدار ہی میں اتارتے ہیں۔ اور ہم نے پانی سے لدی ہوئی ہوائیں بھیجیں، پھر ہم نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اسے تمہیں پلایا، مگر تم اسے جمع کر رکھنے پر قادر نہیں ہو (بلکہ ہم جب چاہیں اسے دھنسا بھی سکتے ہیں)۔ یقیناً ہم ہی (پانی کی بالترتیب فراہمی اور معدومی کے ذریعے زمینوں کو) زندہ اور مردہ کرتے ہیں، اور ہم ہی (ان کی موت کے بعد ان کے) وارث بھی بن جاتے ہیں۔ اور ہم تم میں سے (ان زمینوں میں بسائے گئے) اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور (ان میں بسائے جانے والے) پچھلوں کو بھی۔ بے شک آپ کا رب ہی ان سبھوں کو جمع کرے گا، یقیناً وہ بڑی حکمت والا بڑا جاننے والا ہے۔

غور کیا جاسکتا ہے کہ یہاں زمینوں کی لفظی صراحت کے بغیر کتنی معنی خیزی کے ساتھ ساری بات ٹھیک انہیں کے تناظر میں کی جارہی ہے۔ مگر جب ان آیات کے سیاق پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلسل پچھلی پانچ آیات سے، جس کی ابتدا ﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ﴾ (یقیناً ہم نے آسمان میں برج بنادئے ہیں اور ناظرین کے لئے اسے آراستہ بھی کر دیا ہے) کے ذریعے کی گئی ہے، کلام آسمان میں مختلف کہکشاؤں کی تخلیق اور وہاں زمینوں کو پھیلا کر ان میں مخلوقات کے لئے اسباب معیشت کی فراہمی ہی پر ہو رہا ہے۔ پھر موجودہ آیات میں ان

اسباب میں سے سب سے اہم اور بنیادی عنصر ''پانی'' کا بیان قدرے تفصیل سے کیا جارہا ہے۔ چنانچہ مردہ زمینوں کو پانی کے ذریعے زندہ کئے جانے اور انہیں ان کی مخلوقات سمیت ایک اور مرتبہ موت کی نیند سلا کر مسطح اور چٹیل میدان بنا دئے جانے: ﴿وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ﴾ (یقیناً ہم ہی زندہ اور مردہ کرتے ہیں) کے بعد ایک بڑی طویل مدت تک یہاں کوئی بھی مخلوق آباد نہیں کی جاتی ہے، اور نہ ہی ان زمینوں کا کوئی وارث ہوتا ہے، جیسا کہ آج مریخ وغیرہ زمینوں کا حال ہے۔ لہذا اس دوران ان کی وارث دوبارہ اکیلی اللہ ہی کی ذات ہوجاتی ہے: ﴿وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ﴾ (ہم ہی ان کے وارث بھی بن جاتے ہیں)۔ پھر تخلیق وتخریب کے اس کائناتی پس منظر میں ﴿وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ﴾ (ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور تمہیں میں سے پچھلوں کو بھی) کے ذریعے ان ساری زمینوں میں ان کے سابقہ اور آئندہ زندہ ادوار میں بسائی جانے والی مخلوقات کی خبر دی جارہی ہے۔ اور آخر میں ﴿وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ، إِنَّهُ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾ (بے شک آپ کا رب ہی ان سبھوں کو جمع کرے گا، یقیناً وہ بڑی حکمت والا بڑا جاننے والا ہے) کے ذریعے اس مفہوم کو مزید تقویت پہنچائی جارہی ہے کہ مخلوقات کے اس محیر العقول وسیع وعریض اور نہایت قدیم کائنات میں بسائے اور پھیلائے جانے میں باری تعالیٰ کی کوئی زبردست حکمت ومصلحت اور منصوبہ بندی کارفرما ہے، اور یہ کہ وہ اپنی بے مثال ہمہ دانی وہمہ علمی کی بنیاد پر ایک دن ان سارے اولین وآخرین کو ہر خطہء کائنات سے چن چن کر ان کی بازپرسی کی خاطر جمع بھی کرے گا۔ چنانچہ اس وقت دوبارہ غور کیا جاسکتا ہے کہ سابق میں ﴿بُرُوْجٍ﴾ سے مراد کہکشاں لے کر ان میں صرف چاندوں کے وجود سے ان کے ساتھی ومراکز زمینوں کے بھی لازمی وجود پر کیا گیا ہمارا استدلال کس قدر درست اور مطابق واقعہ تھا۔

پھر ملاحظہ ہو کہ یہاں ان تمام زمینوں کی ساری ہی متقدم مخلوقات کا تعارف ہم سے ﴿الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ﴾ (تمہیں میں سے اگلے) کے ذریعے کیا جارہا ہے کہ وہ سب کی سب ہم ہی میں سے یعنی ہم انسانوں ہی کی ہیں! اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے بعد ﴿الْمُسْتَاْخِرِيْنَ﴾ لاکر اس پر ایک اور اضافہ یہ بھی کیا جارہا ہے کہ ان میں آگے چل کر بسائی جانے والی متاخر مخلوقات بھی ٹھیک انہی کی قبیل سے ہوں گی۔ اس طرح اوپر اعراف: ۱۰۰ کے تحت اس تعلق سے معزز قارئین سے کئے گئے ہمارے وعدے کی تعمیل کی یہ پہلی مثال ہے۔ اس نوع کی مزید مثالیں ابھی آگے بھی پیش ہونے والی ہیں۔ انشاء اللہ العزیز اس موضوع کے مختلف مزید گوشوں پر بھی سیر حاصل بحث ہم اپنے اگلے مضمون میں کریں گے۔ مزید برآں قرآن مجید انہی ﴿الْمُسْتَقْدِمِيْنَ﴾ کو یس: ۳۱-۳۳ کے تحت ہماری زمین کے پس منظر میں ﴿كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُوْنِ﴾ (ہم نے ان سے قبل کتنی ہی نسلوں کو ہلاک کردیا ہے) اور مریم: ۹۳-۹۸ کے تحت کائناتی تناظر میں ﴿كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ﴾ (ہم نے ان سے قبل کتنی ہی نسلوں کو ہلاک کردیا ہے) کہتا ہے، جس سے وہاں پر وضع کیا گیا ہمارا یہ کلیہ مضبوط تر ہوجاتا ہے کہ ﴿قَرْنٌ﴾ سے مراد کسی بھی

زمین کے ایک زندہ دور کی پوری انسانی مخلوق ہوتی ہے۔ اب حسب ذیل آیت پاک ملاحظہ ہو جو اس مفہوم کو مزید تقویت پہنچاتے ہوئے یہاں پائے جانے والے ابہام کی مزید توضیح بھی کرنے والی ہے:

۲۰- ﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا، فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا، وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ﴾ (قصص:۵۸)

ترجمہ: کتنی ہی ایسی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ہے جو اپنی خوش عیشی پر اترانے والی تھیں، سو وہ ان کے مسکن ہیں جن کے بعد وہ کم ہی آباد ہوئے، اور ان کے وارث ہم ہی بنے۔

یہ آیت اپنے متصل مابعد والی آیت سے مل کر کائناتی تناظر میں ایک اہم آفاقی حقیقت کا انکشاف کرنے والی ہے۔ لہذا ہم اس آخری آیت پر کلام آگے کریں گے۔ اس وقت موضوع بحث یہاں مذکور صرف پہلی آیت ہی ہے۔ چنانچہ سابقہ آیات میں ﴿وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ﴾ کے ذریعے زمینوں کے صریح ذکر کے بغیر ہی ان کی موت وحیات کا جو معنی خیز سبق دیا گیا تھا یہاں ٹھیک یہی درس انہیں بطور کنایہ ﴿قَرْيَةٍ﴾ اور ﴿مَسَاكِنُ﴾ کہہ کر دیا جا رہا ہے۔ اسی لئے اس مفہوم پر دلالت کرنے کے لئے دونوں جگہ یکسانیت کے ساتھ ﴿وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ﴾ کی تعبیر دہرائی جا رہی ہے، کیوں کہ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، تعبیر کی یہ مماثلت معنوی یگانگت کی جانب بلیغ اشارہ بھی کرتی ہے۔

پھر ﴿فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (سو وہ ان کے مسکن ہیں جن کے بعد وہ کم ہی آباد ہوئے) کے ذریعے یہ فائدہ پہنچاتے ہوئے کہ ان کے اُن اجڑے دیاروں میں سے بعد میں بہت ہی کم کو آباد کیا گیا ہے ہمیں اس سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ ملحوظ رہے کہ اوپر ٹھیک اسی مفہوم کی تعبیر ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ﴾ (کیا انہوں نے اپنے اوپر اڑنے والوں کو اس حال میں نہیں دیکھا کہ ان میں بہت سے اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہیں اور بہت سے انہیں سمیٹ بھی رہے ہیں) کے ذریعے ہمیں ان سے عبرت حاصل کرنے پر ابھارا گیا تھا۔ اس طرح یہ دونوں فقرات باہم ایک دوسرے کی تفسیر وتوجیہ کرنے والے ہیں۔ نیز اس وقت سابقہ ﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرَىٰ﴾ بھی مستحضر رہے، جس کے ذریعے ہمارے اطراف واکناف کی بستیوں کو ہلاک کر دئے جانے کی خبر دی گئی تھی۔ چنانچہ آخر الذکر ان دونوں فقرات کے ذریعے موجودہ ارشاد اور زیادہ مضبوط ومستحکم ہو جاتا ہے۔

پچھلے ارشاد ربانی میں ﴿الْمُسْتَأْخِرِينَ﴾ کے ذریعے عمومی طور پر ساری کائناتی زمینوں میں آگے بھی مزید انسانی نسلوں کو بسائے جانے کا جو نہایت دوررس اور انقلاب انگیز پیغام دیا جا رہا ہے اس میں خود ہماری زمین بھی بنفس نفیس شامل ہے۔ اور وہ ہو بھی کیوں نہیں سکتی ہے، جب کہ اس طرح کے متعدد ادوار کو وہ پہلے بھی اپنے اوپر بتا چکی ہے، اور خود

سابقہ قرآنی تصریحات ہی کے مطابق ہمارے بعد بھی وہ مکمل طور پر انتشار و پراگندگی کا شکار اور نیست و نابود ہونے والی نہیں ہے۔ لہٰذا اب اس مفہوم کی مزید تائید و تقویت کے لئے حسب ذیل تین الٰہی بیانات بھی ملاحظہ ہوں:

۲۱- ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا، قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (حدید:۱۷)

ترجمہ: جان لو کہ اللہ زمینوں کو ان کی موت کے بعد بھی زندہ کرے گا۔ تمہاری سمجھ بوجھ ہی کی خاطر ہم نے نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔

زمینوں کی موت و حیات پر جاری ہماری موجودہ بحث سے بخوبی ظاہر ہے کہ یہاں بھی ﴿اَلْاَرْضُ﴾ کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہوا ہے، جس سے اس تعلق سے اخذ کردہ ہمارا سابقہ عمومی کلیہ اور زیادہ مدلل و مستحکم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں نہایت دوٹوک الفاظ میں اور ﴿اِعْلَمُوْا﴾ کے ذریعے بطور تاکید یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ بالعموم ساری ہی زمینوں کو ان کی اپنی اپنی اموات کے بعد بھی یقینی طور پر زندگی سے بہرہ ور کیا جائے گا۔ اب انہیں زندہ کئے جانے سے کنایہ حسب سابق ان میں اگلی انسانی مخلوقات کو بسایا جانا ہی ہے۔ اس طرح یہ ارشاد ساری زمینوں میں آگے بھی بسائے جانے والے ﴿اَلْمُسْتَاْخِرِيْنَ﴾ کی حقیقت کو مزید موکد کرنے والا ہو جاتا ہے۔

۲۲- ﴿اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ. ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ﴾ (مرسلات:۱۶-۱۷)

ترجمہ: کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا ہے؟ پھر (یعنی ایک مدت بعد) ہم دوسروں کو بھی ان کے تابع کر دیں گے۔

جیسا کہ اوپر تصریح کی جا چکی ہے، موجودہ سورۂ مرسلات کی ساتویں آیت میں ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ﴾ کے ذریعے قیامت اور روز جزا کے یقینی وقوع کی خبر دیتے ہوئے آگے بطور دلیل نوع انسانی سے جو تین سوالات کئے گئے تھے ان میں سے موجودہ بیان کا تعلق پہلے سوال سے ہے۔ لہٰذا یہاں بھی انسان کو کسی اہم مظہر ربوبیت ہی کی جانب توجہ دلائی جانی مقصود ہے۔ چنانچہ وہاں مذکور اس سلسلے کے تیسرے سوال کی نوعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود اُسے بھی موجودہ پہلے سوال کی شہادت ہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یعنی وقوع قیامت اور قیام آخرت پر دلیل قائم کرتے ہوئے نہ صرف اولین بلکہ مستقبل میں ایک مدت بعد آنے والے آخرین کو بھی ہلاک کرنے کی جو یقینی خبر یہاں دی جا رہی ہے خود اس کی شہادت تیسرے سوال کے ذریعے پیش کی جا رہی ہے کہ کیا زمینوں کو بکثرت زندگیوں اور اموات والی نہیں بنایا گیا ہے؟ چنانچہ اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ ان اولین اور آخرین کا تعلق زمینوں کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں ہی سے ہے۔ اس طرح یہاں مذکور ﴿اَلْاَوَّلِيْنَ﴾ اور ﴿اَلْاٰخِرِيْنَ﴾ سابقہ ﴿اَلْمُسْتَقْدِمِيْنَ﴾ اور ﴿اَلْمُسْتَاْخِرِيْنَ﴾ پر پوری طرح منطبق ہونے والے ہیں۔ نیز اس وقت یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ جس طرح ﴿اَلْمُسْتَقْدِمِيْنَ﴾ اور ﴿اَلْمُسْتَاْخِرِيْنَ﴾ میں ہماری موجودہ نسل انسانی مذکور نہیں تھی اسی طرح ﴿اَلْاَوَّلِيْنَ﴾ اور ﴿اَلْاٰخِرِيْنَ﴾ میں بھی نہیں ہے، کیوں کہ یہاں مقصود صرف یہ خبر دینا ہے کہ کائنات کی ساری متقدم و متاخر مخلوقات خود انسانوں ہی کی ہیں۔

۲۳- ﴿نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ أَسْرَهُمْ، وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا﴾ (دہر:۲۸)

ترجمہ: ہم ہی نے انہیں پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کئے ہیں، اور یقیناً ہم جب چاہیں ان کے بدلے ان جیسوں کو کثرت سے بدل بدل کر لے آئیں گے۔

یہاں خطاب کے طرز سے ظاہر کہ وہ موجودہ نسل انسانی سے عمومی نوعیت ہی کا ہے۔ نیز ﴿بَدَّلْنَا﴾ باب "تفعیل" سے ہے، جس کا ایک وصف تکثیر ومبالغہ بھی ہے۔ اور اس فعل کے بعد اس کا مصدر ﴿تَبْدِيْلًا﴾ بھی دہرایا گیا ہے، جس سے تکثیر کے معنے اور زیادہ موکد ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ﴿إِذَا﴾ حرف شرط ہے، جس کا استعمال کسی یقینی اور معلوم الوقوع امر کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ ﴿وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا﴾ کا نہایت واضح مطلب یہ ہوا کہ باری تعالیٰ جب چاہے یقینی طور پر یہاں موجودہ نسل انسانی کے بعد بھی ان جیسوں یعنی مختلف انسانی نسلوں کو بکثرت بدل بدل کر لے آئے گا۔ یعنی ہمارے بعد یہاں صرف ایک اور نسل ہی کو نہیں بلکہ اس سلسلۂ خلق وفنا کو متعدد مزید مرتبہ بھی دہرا کر اس میں ہر مرتبہ ایک علاحدہ نسل انسانی کو بسایا جائے گا۔ اس طرح سابقہ حجر:۲۱-۲۵ میں مذکور ﴿مِنْكُمْ﴾ کی تشریح یہاں بصیغہ غائب ﴿أَمْثَالَهُمْ﴾ کے ذریعے کی جارہی ہے۔ چنانچہ اگر اس زمین کی ابھی اس قدر زندگیاں اور ان میں بسائی جانے والی اتنی ساری انسانی نسلیں باقی ہیں تو اس پر دیگر ساری زمینوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح سابقہ ﴿الْمُسْتَأْخِرِيْنَ﴾ (بعد میں آنے والی مخلوقات) اور ﴿ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِيْنَ﴾ (پھر ایک مدت بعد ہم دوسروں کو بھی ان کے تابع کردیں گے) اور موجودہ ﴿إِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا﴾ (یقیناً ہم جب چاہیں ان کے بدلے ان جیسوں کو کثرت سے بدل بدل کر لے آئیں گے) صرف ہماری موجودہ زمین کے پس منظر میں باہم ایک دوسرے کی شرح وتفسیر کرنے والے ہیں۔ ــــــ پچھلے مسلسل پانچ ارشادات ربانی کے ذریعے ہمارے بعد بھی خود ہماری زمین کے اور دیگر ساری ہی آسمانی زمینوں کے متعدد مزید زندہ ادوار اور ان میں بکثرت انسانی نسلوں کی باز آبادکاری کی یہ قرآنی تصریحات ہمارے لئے ایک اور گہری بصیرت کی بھی حامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں یہ کائنات کسی بھی طرح عمومی وکلی طور پر ختم ہونے والی نہیں ہے۔ بلکہ اس عمومی قیامت کبریٰ سے قبل جزوی وعلاقائی اور زمینی سطح پر تخلیق وتخریب اور قیامات صغریٰ کا ابھی بہت سارا سلسلہ باقی بھی ہے۔ حسب ذیل آیات کریمہ کائناتی سطح پر ٹھیک انہی جزوی قیامتوں کا بیان ایک دیگر پیرایے میں اس طرح کررہی ہیں:

۲۴- ﴿... وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَأْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ، إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ. وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ، فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ﴾ (رعد:۳۱-۳۲)

ترجمہ: اللہ کے وعدے کی تکمیل تک کفار کو خود ان کے اعمال کے عوض ایک کھڑکھڑانے والی آواز مسلسل لاحق ہوتی جائے

گی یا ان کی بستی کے قرب وجوار ہی میں نازل ہوتی رہے گی۔ بے شک اللہ اپنے وعدے کو نہیں ٹالتا ہے۔ آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مزاق اڑایا جاچکا ہے۔ چنانچہ میں نے کفار کو کچھ مہلت دے کر پھر پکڑا، سو میرا بدلہ کیسا تھا؟

یہاں ﴿قَارِعَۃ﴾ سے کیا مراد ہے اس کی تفسیر خود سورۂ قارعہ میں اس طرح کی گئی ہے:

﴿اَلْقَارِعَۃُ. مَا الْقَارِعَۃُ. وَمَآ أَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَۃُ. یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ. وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ (قارعہ:۱-۵)

ترجمہ: کھڑکھڑانے والی آواز، کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی آواز؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کھڑکھڑانے والی آواز کیا ہے؟ جس دن لوگ منتشر پروانوں کی طرح ہو جائیں گے۔ اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے۔

نیز ایک اور موقع سے اس کی تعبیر اس طرح آئی ہے: ﴿اَلْحَآقَّۃُ. مَا الْحَآقَّۃُ. وَمَآ أَدْرٰکَ مَا الْحَآقَّۃُ. کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَۃِ﴾ (حاقہ:۱-۴) ترجمہ: واقع ہو کر رہنے والی چیز، کیا ہے وہ واقع ہو کر رہنے والی چیز؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ واقع ہو کر رہنے والی چیز کیا ہے؟ ثمود اور عاد نے اس کھڑکھڑانے والی آواز کو جھٹلایا۔

قرآن مجید میں صرف یہی تین مقامات ہیں جہاں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اس آخر الذکر مقام پر ظاہر ہے کہ ﴿اَلْقَارِعَۃُ﴾ کو ﴿اَلْحَآقَّۃُ﴾ کے بدل کے طور ہی پر لایا گیا ہے۔ اس طرح یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ہم معنی ٹھہرتے ہیں۔ چنانچہ قرآنی اصطلاح میں ﴿قَارِعَۃ﴾ سے مراد کھڑکھڑاتے ہوئے واقع ہو کر رہنے والی ایک ایسی آواز ٹھہرتی ہے جس کے نتیجے میں لوگ منتشر پروانوں کی طرح اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے۔

اب جہاں تک متقدمین کا سوال ہے تو ظاہر ہے کہ انہوں نے ان آخر الذکر دو مقامات پر اس سے مراد قیامت لی ہے۔ مگر اول الذکر مقام پر یعنی زیر بحث آیات میں چونکہ یہ اشکال پیدا ہوتا تھا کہ آخر کفار کو قیامت مسلسل طور پر کہاں لاحق ہو رہی ہے لہذا اسے دفع کرنے ہی کی خاطر بطور تاویل اس کے معنے ''مصیبت'' ٹھہرائے گئے۔

مگر اب الفاظ قرآنی سے بالکل عیاں ہے کہ اس ﴿قَارِعَۃ﴾ کے نزول کے نتیجے میں جس تباہی کا ذکر یہاں ہو رہا ہے اس کا تعلق ساری کائنات سے نہیں بلکہ صرف ایک ہی زمین سے ہوتا ہے۔ جب کہ خود قرآن مجید ہی کے مطابق قیامت کا وقوع سارے آسمانوں اور ساری زمینوں میں عمومی اور کلی طور پر ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں اس کی ساری موجودات تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں، جیسا کہ حسب ذیل ارشادات باری:

﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ أَیَّانَ مُرْسٰھَا، قُلْ إِنَّمَا عِلْمُھَا عِنْدَ رَبِّیْ، لَا یُجَلِّیْھَا لِوَقْتِھَا إِلَّا ھُوَ، ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ...﴾ (اعراف:۱۸۷)

ترجمہ: وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ قیامت کا وقوع کب ہوگا۔ آپ کہہ دیجئے کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، وہی اسے اپنے وقت پر ظاہر کرے گا، وہ سارے آسمانوں اور زمینوں میں بھاری ہوگی۔

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ...﴾ (زمر:۶۸)

ترجمہ: صور پھونکا جائے گا تو جو کوئی سارے آسمانوں اور زمینوں میں ہیں سب کے سب بے ہوش ہو جائیں گے بجز ان کے جنہیں اللہ چاہے۔

لہذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ﴿قَـــارِعَةٌ﴾ سے مراد ساری کائنات میں واقع ہونے والی عمومی قیامت نہیں بلکہ اب تک کے مباحث کے ذریعے متعدد طرق سے اور نہایت مدلل طور پر ثابت شدہ کسی بھی زمین کو مکمل طور پر ڈھانک کر بنجر کر دینے والی جزوی وعلاقائی قیامت ہی ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں نہ صرف سابق ہی میں ہماری، ہمارے گرد ونواح کی اور ساری کائنات کی بے شمار زمینیں کئی مرتبہ تباہ ومردہ ہو چکی ہیں، بلکہ یہ سلسلۂ تخریب وفنا پوری قوت وطاقت کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ اس طرح اس قرآنی اصطلاح کی جدید توجیہ کے نتیجے میں اس کا ہر جگہ یکسانیت کے ساتھ ایک ہی مفہوم ٹھہرتا ہے، اور اس میں کہیں بھی کسی تاویل کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

چنانچہ موجودہ ارشاد میں بھی سارے آسمانوں کے تناظر میں ٹھیک اسی عذاب کی منظر کشی کی جا رہی ہے کہ کفار جہاں کہیں بھی ہوں انہیں یہ عذاب لاحق ہو کر لگاتار ان کی بستیوں اور زمینوں کو موت کے گھاٹ اتارتا جا رہا ہے یا ان کے قرب وجوار کی زمینوں ہی کو مسلسل اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اسی لئے یہاں کفار کی جائے قرار پر دلالت کرنے کے لئے ﴿دَارٌ﴾ بصیغہء واحد لایا گیا ہے۔ لہذا جس طرح سابق میں زمینوں کو بطور کنایہ ﴿قَرْيَةٌ﴾ اور ﴿مَسٰكِنُ﴾ کہا گیا تھا ٹھیک اسی معنے میں یہاں ﴿دَارٌ﴾ کا استعمال بھی ہوا ہے۔

نیز اس مفہوم کو تقویت پہنچانے والی ایک مزید اور نہایت طاقتور دلیل خود اس سے متصل اگلی آیت بھی ہے، جو اپنی پچھلی آیت کی بحسن وخوبی شرح وتفسیر کرتے ہوئے ﴿قَـــارِعَةٌ﴾ کی حقیقی مراد پر بھرپور روشنی ڈالنے والی ہے۔ چنانچہ ﴿وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ، فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ﴾ (آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مزاق اڑایا جا چکا ہے۔ چنانچہ میں نے ان کفار کو کچھ مہلت دے کر پھر پکڑا، سو میرا بدلہ کیسا تھا؟) پوری وضاحت کے ساتھ ناطق ہے کہ کفار کو مسلسل لاحق ہونے والی وہ کھڑکھڑانے والی آواز حقیقتاً یہی عذاب الٰہی ہوتا ہے، جو اس طبقے کو اس سے قبل بھی لاحق ہو چکا ہے۔ البتہ اس وقت یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ عذاب جب بھی کسی زمین پر نازل ہوتا ہے تو اس وقت اس میں لامحالہ طور پر بہت سارے مومنین بھی موجود رہیں گے تو اسے صرف کفار کے ساتھ مخصوص کرنے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ لیکن جیسا کہ ہمارے اگلے مضامین سے ثابت ہوگا طبقۂ مومنین کو ہر جگہ اس عذاب سے بچا لیا جاتا ہے۔ (جاری ہے)